شیخ یوسف قرضاوی

الایمان والحیات

[یہ مضمون مشہور عرب عالم دین شیخ یوسف قرضاوی کی کتاب الایمان والحیاۃ کے چند ابواب کی تلخیص اور ترجمہ ہے]

ایمان محض دعویٰ کا نام نہیں۔ کسی شخص کا زبان سے یہ اعلان کر دینا کہ وہ مومن ہے اُسے مومن نہیں بنا دیتا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ "اور کتنے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لائے حالانکہ وہ ایمان دار نہیں"۔ اسی طرح مومنوں کے اعمال سے ملتے جلتے اعمال اختیار کر لینے کو بھی ایمان سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ بعض دجل و فریب کے علمبردار نیک اعمال کو شعار بنا لیتے ہیں حالانکہ ان کے دل صلاح و خیر سے یکسر خالی ہوتے ہیں۔ ذہنی طور پر بعض حقیقتوں کی معرفت حاصل کر لینے کو بھی ایمان کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اِس لیے کہ بہت سے لوگ دلائل و براہین کی رُو سے حقائقِ ایمان کے قائل ہو چکے ہوتے ہیں مگر تکبّر، حسد یا محبتِ دنیا اُن کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے اور وہ دولتِ ایمان سے محروم رہتے ہیں۔ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا اور انہوں نے سر بسر ظلم اور تمرّد کی بنا پر اُن آیات کا انکار کیا حالانکہ ان کے دل قائل ہو چکے تھے۔

ایمان درحقیقت ایک ایسا اخلاقی اور روحانی عمل ہے جو دل و دماغ کی گہرائیوں تک اپنا اثر و نفوذ رکھتا ہے۔ اور انسان کے ارادہ و اختیار، عقل و شعور اور وجدان — ہر ایک چیز کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ وہ وحی و الہام کی مدد سے انسان پر حقائقِ وجود کا انکشاف کرتا ہے اور یہ انکشاف محض علم کی حد تک ہی نہیں رہتا بلکہ جزم و یقین سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ اور پھر ریب و شک کا کوئی حملہ بھی اس کے یقین کو متزلزل نہیں کر سکتا۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ

ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا ۔ دراصل ایماندار وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر کسی شک میں مبتلا نہ ہوئے۔ حقائق کا یہ یقینی علم جو کسی انسان کو ایمان کی بدولت نصیب ہوتا ہے۔ اس کے دل کو ذاتِ حق کے تابع کر دیتا ہے۔ اس کے ارادہ و اختیار کو سمع و طاعت سکھاتا ہے اور اس کے تکبّر و غرور کو خشوع و خضوع میں بدل دیتا ہے۔ اور بالآخر گوشت پوست کا یہ مجسّمہ تسلیم و رضا کا پیکر بن کر سامنے آتا ہے۔ اس کے بعد معرفتِ حق انسان کے اندر حرارتِ عمل پیدا کرتی ہے۔ اور عقیدہ و ایمان کے مقتضیات کی تکمیل کے لیے اسے سرگرم بنا دیتی ہے۔

ایک مومن کی زندگی کا یہی پہلو ہے ـــــ عملی پہلو ـــ جسے قرآن خوب نمایاں کر کے اور پورے زور کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ مومن کی زندگی محاسنِ اعمال کا مجموعہ ہوتی ہے۔ وہ بہترین اخلاق کا حامل ہوتا ہے۔ خوفِ خدا سے اس کا دل معمور رہتا ہے۔ مصائب و مشکلات میں صبر و استقامت سے کام لیتا ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ نیز صیام و حج کے فرائض خلوصِ دل سے بجا لاتا ہے۔ جان و مال سے خدا کی راہ میں جہاد کرتا ہے۔ فواحش و منکرات اور لغو اور لایعنی اُمور سے قطعی پرہیز کرتا ہے۔ دن کی مصروفیتیں ہوں یا رات کی خلوتیں، سب میں یادِ الٰہی اولیّت کا مقام رکھتی ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کبھی دستکش نہیں ہوتا۔ خدا کے اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرتا ہے۔ ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ عہد و پیمان کی پابندی کرتا ہے۔ ہر ایک سے لطف و محبّت سے پیش آتا ہے۔ اور اخوّت و مودّت کا برتاؤ کرتا ہے۔ غرض بندۂ مومن ہر شعبۂ زندگی میں تقاضائے ایمان کو عملاً پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور لوحِ ہستی سے کفر و جاہلیّت کا ایک ایک نقش مٹا کر چھوڑتا ہے۔ وہ ہدایت و ضلالت میں کبھی مصالحت کی کوشش نہیں کرتا۔ نہ معصیت و طغیان کے بارے میں تساہل اور مداہنت سے کام لیتا ہے۔ اور جب تک اپنے دائرۂ اختیار میں بُرائی کا سر کچل نہیں دیتا اُسے چین نہیں آتا۔

عقیدہ و رائے کا فرق | بعض لوگ عقیدہ و ایمان کو فکر و نظر اور خیال و رائے کے معنی میں لے لیتے ہیں۔ حالانکہ عقیدہ و رائے میں بہت بڑا فرق ہے۔ رائے انسان کے دائرۂ معلومات میں ایک چیز کے اضافہ کا نام ہے جبکہ عقیدہ اس کی رگوں میں خون کی طرح گردش کرتا اور اسے سرگرمِ عمل رکھتا ہے۔ اس کی ہڈیوں کے گودے اور دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوتا ہے۔ صاحبِ رائے کی حیثیت

ایک فلسفی کی سی ہوتی ہے جو ایک بات کو درست سمجھ لیتا ہے حالانکہ وہ تحقیقاً غلط ہوتی ہے۔ آج ایک چیز کے حق میں دلیل دیتا ہے اور اگلے ہی دن اس کے برعکس موقف اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں صاحبِ عقیدہ، یقین کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔ وہ شکوک و شبہات کا شکار نہیں ہوتا اس کا عقیدہ حق ہوتا ہے، آج بھی حق اور کل بھی حق۔ وہ دلیل کی زد سے باہر اور ظن و تخمین کی سطحِ پست سے بہت بلند ہوتا ہے۔ صاحبِ رائے کے لیے مفاد یا مصلحت کے زیرِ اثر بدل جانا بڑا آسان ہوتا ہے لیکن صاحبِ عقیدہ اِس کردار کا مظہر ہوتا ہے کہ[1] "اگر میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں پر چاند بھی لا کر رکھ دو اور جس پیغامِ حق کو لے کر میں آیا ہوں اس سے دست بردار ہو جانے کے لیے کہو تو ایسا کبھی نہیں ہو سکتا، اور مَیں اپنے مشن کو ہرگز ترک نہیں کر سکتا"۔ رائے کی مثال ایک بے حس و حرکت جسد کی ہے اور عقیدہ اس میں رُوحِ حیات پھونکتا ہے۔ رائے ایک ناپائدار قطعۂ نور ہے تو عقیدہ ایک کوکبِ درخشندہ۔ رائے ایک تاریک غار کی مانند ہے جسے عقیدہ کی روشن شعاعیں منور کرتی ہیں۔ رائے کھڑے پانی کا ایک جوہڑ ہے جس کی سطح پر ضرر رساں حشرات انڈے بچے دے دیتے ہیں اور عقیدہ ایک بحرِ زخار ہے جو ایسی کسی مخلوق کو اپنی پُرشور لہروں پر توالد و تناسل کی اجازت نہیں دیتا۔ رائے شدائد و مصائب کو جنم دیتی، دشوار راہوں کو پیش کرتی، تن و شکم کے ارمانوں پہ کان دھرتی اور تذبذب اور تردّد کو اُبھارتی ہے اور عقیدہ خطرات کو عبور کرتا ہوا، پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلاتا ہوا، زمانے کا رُخ پھیرتا ہوا اور تاریخ کی گردش کو بدلتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہاں خدشات کا نام و نشان نہیں ملتا۔ حزم و یقین کی فراوانی ہوتی ہے۔ اور روح کی امنگ کے علاوہ کوئی چیز بار نہیں پا سکتی۔

<u>ایمان کے مشتملات</u> | عقیدۂ اسلام یعنی ایمان، آسمانی تعلیمات کا اصل الاصول ہے جو اللہ، روزِ آخر، ملائکہ، کُتبِ الٰہی اور انبیاء و رسل کی تصدیق سے عبارت ہے۔ اور یہ کوئی نو دریافت چیز نہیں بلکہ آدم علیہ السّلام سے لے کر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلّم تک جتنے بھی انبیاء و رسل علیہم السلام مبعوث ہوئے سب کی تعلیم و تبلیغ کا مرکز و محور یہی عقیدہ رہا ہے۔ ایمان ایک ایسا جوہر ہے جو عہدِ طفلی

---

[1] یہ بات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابو طالب سے اس وقت کہی جب انہوں نے حضورؐ کو دینی خدمت سے باز رکھنے کی تلقین کی۔

سے لے کر دورِ کہولت تک انسان کے ساتھ رہتا ہے۔ اور اس کی زندگی کے ہر گوشے پر نہایت گہرے اثرات مترتب کرتا ہے۔ یہ وہ عقیدہ ہے جس سے کائنات کی گرہیں کھلتی ہیں۔ رازِ حیات سے پردہ اٹھتا ہے اور عقل و خرد کی لاینحل گتھیاں سلجھتی ہیں۔ اس عقیدے نے فکرِ توحید کو اُن آمیزشوں سے پاک کیا جن سے ہر دور کی ضلالتیں اسے آلودہ کرتی رہیں۔ مقامِ نبوت اور منصبِ رسالت کو اسی نے غلط تصورات سے بچایا اور نکھار کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ آخرت کی جزا و سزا کے بارے میں جاہلوں کے اوہام اور باطل پرستوں کی مغالطہ آمیزیوں کا ازالہ بھی یہی عقیدہ کرتا رہا۔

اس عقیدہ کے عناصرِ اساسی تین ہیں (۱) ایمان باللہ (۲) ایمان بالرسالۃ (۳) ایمان بالآخرت۔

۱۔ ایمان باللہ (۱) وجودِ باری تعالیٰ۔ دلائل و براہین سے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک ایسی قوت کارفرما ہے جو اس کی تدبیر و انتظام میں مصروف ہے۔ کسی نے اُسے "علتِ اولیٰ" سے موسوم کیا، کسی نے اُسے "عقلِ اوّل" اور کسی نے "محرکِ اوّل" کا نام دیا۔ کتبِ سماوی میں صفاتِ جمال و جلال کی جامع اُسی ذات کو "اللہ" سے تعبیر کیا گیا ——— اس بلند ترین ہستی اور اس عظیم ترین قوت ——— اللہ العظیم ——— کی حقیقت کو پالینا ذہنِ انسانی کے بس کی بات نہیں۔ جب انسان خود اپنی ذات اور روح کا فہم حاصل نہیں کر سکا اور برق و مقناطیس جیسے بہت سے مادی امور کی تہ تک نہیں پہنچ سکا تو اللہ العلی الکبیر کی ذات کا عرفانِ حقیقی اس کے لیے کہاں ممکن ہے؟

ع بآدمے نہ رسیدی خدا چہ مے جوئی

البتہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے کرشمے اور اس کی قدرت کے مظاہر ہر جگہ دیکھے جا سکتے ہیں۔ قرآنِ پاک نے وجودِ باری تعالیٰ کا اثبات مختلف پیرایوں میں کیا ہے۔ (۱) ہر موجود کو وجود میں لانے والا اور ہر مخلوق کا کوئی خالق ضرور ہونا چاہیے۔ عقل مطالبہ کرتی ہے کہ کائنات کے اس زبردست نظام کے پیچھے کوئی منتظم ہو۔ (۲) انسان اپنی فطرت اور اپنے لاشعور میں ایک بلند و برتر ہستی کا تصور موجود پاتا ہے جسے ممکن ہے وہ عیش و عشرت کے ایام میں فراموش کر دے لیکن جونہی مصائب و شدائد کا نزول شروع ہوتا ہے تو وہ اُبھر کر اس کے شعور کی سطح پر آجاتا ہے۔ وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ (الروم: ۳۳)۔ (۳) قرآن تاریخ سے استشہاد کرتا ہے کہ انسانیت کی نجات وجودِ باری تعالیٰ پر ایمان میں مضمر ہے۔ ایک حیرت ناک تسلسل کے ساتھ قومیں تباہ و برباد

ہوتی رہیں مگر کچھ مخصوص لوگ بچا لیے جاتے رہے۔ اگر کوئی حکیم و دانا ہستی موجود نہیں تو آخر تاریخ کے صفحات پر ایک ہی طرح کا فیصلہ کیوں ثبت ہوتا رہا؟

(ب) إِلٰهٌ وَّاحِدٌ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا اور بھی کئی الٰہ ہوتے تو (زمین و آسمان) کا نظام بگڑ جاتا۔ پس پاک ہے اللہ رب العرش اِن باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں" (الانبیاء: ۲۲) ایک اور جگہ فرمایا "اللہ نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا ہے اور کوئی دوسرا خدا اُس کے ساتھ نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہو جاتا اور پھر وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے۔ پاک ہے اللہ اِن باتوں سے جو یہ لوگ بناتے ہیں (المومنون: ۹۱)

اِن آیات سے بدیہی طور پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں اور نہ اسے کسی شریک کی ضرورت ہے۔ اور نہ یہ نظامِ کائنات اپنی فطرت کے اعتبار سے کسی شریکِ خدا کی شراکت کا متحمل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ جب پیدا کرنے، رزق دینے اور اپنی مخلوقات کی مشکلات دُور کرنے میں اکیلا ہے تو عبادت بھی اُس اکیلے کی ہو گی۔ اور اطاعت و فرمانبرداری بھی اُسی وحدہٗ لاشریک کی کی جائے گی۔ اُس یکتا و بے ہمتا کے علاوہ کسی سے ڈرنے یا کسی پر بھروسا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہی وہ تعلیم ہے — توحیدِ باری تعالیٰ اور تقدیسِ ذاتِ حق کی تعلیم — جو تمام انبیاء نے بالاتفاق دنیا والوں کو دی۔ اور لا الٰہ الا اللہ ہی وہ کلمۂ اخلاص اور کلمۂ تقویٰ ہے جسے اہلِ اسلام نے حرزِ جان بنایا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ تمام جبّاروں، طاغوتی طاقتوں اور معبودانِ باطل کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے۔ یہ وہ عالمی پکار ہے جو انسان کو انسان کی غلامی اور مادہ و طبیعت کی بندگی سے نجات دلاتی ہے۔ لا الٰہ الا اللہ حقیقی انسانی اخوت، اور سچی عزت و آزادی کی نہایت مضبوط بنیاد ہے۔ یہ الٰہِ حقیقی کا تعلق کسی خاص قبیلے، قوم یا ملک سے نہیں جوڑتی بلکہ اسے "رب العٰلمین" "رب السمٰوات"، اور "رب المشرق والمغرب" قرار دے کر ہر انسان کو اُسی کا حلقہ بگوش بننے کی دعوت دیتی ہے۔ لا الٰہ الا اللہ ایک نئے معاشرہ کی تشکیل کا اظہار ہے جو جاہلی معاشروں سے بالکل مختلف ہو گا۔ عقیدے کے اعتبار سے بھی اور طریقِ کار کے لحاظ سے بھی۔ یہ معاشرہ نہ مادّی ہو گا نہ وطنی اور نہ طبقاتی۔ بلکہ اسے صرف ذاتِ وحدہٗ لاشریک سے ایک نسبتِ خاص ہو گی۔

(ج) صفاتِ الٰہی کا کمال۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی وحدانیت پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ

اس کی جملہ صفات کو کامل و مکمل اور ہر عیب و نقص سے منزہ ماننا بھی لازم ہے۔ ذاتِ حق کی صفات کے کمال پر کائنات کا ذرّہ ذرّہ دلالت کرتا ہے۔ موجودات میں سے ہر چیز کی انوکھی اور نرالی بناوٹ، اس کا حکیمانہ اور متوازن فروغ و ارتقاء، اس میں حسن و جمال کی کارفرمائی اور اس کی مضبوطی و استحکام ایسی خصوصیات ہیں جو پیدا کرنے والے کی شانِ کمال کا پتہ دیتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہے اس سے کوئی چیز مخفی نہیں۔ وہ زبردست قدرت اور بے پناہ طاقت کا مالک ہے۔ کوئی اسے عاجز نہیں کر سکتا نہ اس کے حکم سے سرتابی کر سکتا ہے۔ زندگی، موت، عزّت اور ذلّت صرف اسی کے ہاتھ میں ہے۔ حکمت و دانائی کا مبدأ و منتہا اور رحمت و رأفت کا منبع وہی ہے۔ اس کی جزا و ثواب اور اس کے انعامات بے حد و حساب ہیں اور اسی طرح اس کا قہر و غضب اور اس کا انتقام بھی اپنی مثال آپ ہے۔

اسلام جس الٰہ حقیقی سے روشناس ہے وہ کائنات سے بے تعلق الٰہ نہیں جیسا کہ ارسطو نے کہا ہے ارسطو کا الٰہ ہے تو سہی لیکن اسے اِس جہان سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ وہ اِس کی طرف متوجہ ہے۔ نہ اس کی تدبیرِ امر فرماتا ہے اور فرما بھی کیسے سکتا ہے۔ اُسے نہ زمین کے بارے میں کچھ علم ہے اور نہ آسمانوں کے بارے میں۔ وہ نہ جوہر ہے نہ عرض ہے نہ اُس کی کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔ نہ وہ مرکّب ہے نہ جزء۔ نہ وہ اس عالم میں داخل ہے نہ خارج۔ نہ اس سے متصل ہے نہ منفصل۔ اُس "محرّکِ اوّل" سے نہ کوئی ڈرتا ہے نہ کوئی دلی لگاؤ رکھتا ہے۔ نہ اُس پر بھروسا اور اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ یونانیوں کا الٰہ ایسا ہی تھا اور مغرب کا جدید فکر بھی اِسی نوعیّت کا الٰہ رکھتا ہے۔ جس کی سرے سے کوئی صفت ہی نہیں صفت کا شانِ کمال رکھنا تو بعد کی بات ہے۔ اس کے برعکس اسلام جس الٰہ پر ایمان رکھنے کی تعلیم دیتا ہے وہ حیّ و قیّوم ہے، علیمٌ بذات الصدور ہے، خالق، مالک اور رازق ہے۔ صاحبِ امر ہے، مدبّرِ کائنات ہے اور فعّالٌ لما یُرید ہے۔ سب اس کے بندے ہیں۔ آسمان میں ملائکہ اور زمین پر جنّ و اِنس اور دوسری مخلوقات۔ جنّ و انس کو ارادہ و اختیار عطا کرنے والا اور نسلِ انسانی کو اپنی خلافت و نیابت کا شرف بخشنے والا وہی ہے۔ وہی ہے حیات و موت کا مالک اور حشر و نشر پر قادر۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔

۲۔ ایمان بالرسالت | اللہ پر ایمان لانے کے بعد، رسولوں پر ایمان کوئی قابلِ تعجب چیز نہیں بلکہ یہ

ایمان باللہ ہی کی ایک فرع ہے۔ اس لیے کہ انسان کی تخلیق اور اس کے لیے موجودات کی تسخیر کے بعد رحمتِ حق کے لیے زیبا نہ تھا کہ وہ اسے صراطِ مستقیم سے ناآشنا رکھ کر بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتی۔ بلکہ یہ عین تقاضائے حکمت تھا کہ جس ذات نے انسان کو مادّی سروسامان سے نوازا تھا وہ اس کے لیے رُوح کی غذا کا اہتمام بھی کرتی۔ اور جس نے اسے پیدائش کے بعد حیاتِ دنیا سے روشناس کیا تھا وہ موت کے بعد حیاتِ آخرت سے بھی اسے باخبر کرتی۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان کی رہنمائی کا بندوبست نہ فرماتے تو اس کا بدیہی نتیجہ یہ نکلتا کہ خواہشات و احساسات رکھنے والی اس مخلوق کے باطنی قویٰ اور خارجی صلاحیتیں خود اسی کی ذات سے اُلجھ کے رہ جائیں۔ اسی طرح قوم اور جماعت کے اجتماعی اغراض و مصالح بھی تصادم کا شکار ہوئے بغیر نہ رہتے اور یہ صورتِ حال اُس رحمت و عنایت کے منافی ہوتی جس کے تحت تخلیقِ انسان عمل میں آئی تھی۔ اور اس شرف و کرامت کے بھی منافی ہوتی کہ جس کی بدولت حضرتِ انسان کو کائنات میں منفرد مقام عطا ہوا تھا۔ لیکن بعثتِ انبیاء کے اس حقیقی پہلو سے صرفِ نظر کرتے ہوئے نوعِ انسانی کی اکثریت، اپنی ہی نوع کے کسی فرد کو منصبِ رسالت پر فائز دیکھ کر اس کا خیر مقدم کرنے کے بجائے حیرت و استعجاب کا اظہار کرتی رہی۔ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۝ (یونس: ۲)۔

انسان زندگی کے کسی مرحلہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے بے نیاز نہیں رہا۔ یہ الگ بات ہے اسے اس کا شعور ہی نہ ہو۔ سب سے پہلے پیدائش کے وقت جب اسے بھوک پیاس کا احساس ہوا تو یہ اللہ تعالیٰ کی رہنمائی ہی تھی کہ جس نے ماں کی چھاتیوں سے اسے غذا حاصل کرنے کی تربیت دی۔ اور ہدایت کی یہ صورت کچھ انسان کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ تمام مخلوقات کے لیے عام ہے۔ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝ (طٰہٰ: ۵۰)۔ پھر دوسرے درجے میں ظاہری و باطنی حواس انسان کی ہدایت کا ذریعہ بنے اور سمع و بصر اور لمس و ذوق کی صلاحیتوں نے اس کے دائرۂ معلومات کو کچھ اور وسیع کر دیا۔ اس کے بعد عقل و شعور کی باری آئی اور بلاشبہ یہ وہ نور تھا جس نے بہت حد تک ظلمت کدۂ حیات میں انسان کی معاونت کی۔ اس کو نفع و نقصان کی معرفت بخشی، خیر و شر کی تمیز عطا کی اور اعلیٰ اغراض اور عظیم الشان مقاصد کے حصول کو اس کے لیے ممکن بنا دیا۔ لیکن یہ سارے

ذرائع ہدایت جو بجائے خود ناگزیر اور بہت کچھ نفع بخش تھے ہر لحاظ سے کافی نہ تھے بلکہ اپنے اندر خطاو سہو کا احتمال رکھتے تھے۔ اِن سے حقیقت کا کچھ نہ کچھ سرا تو انسان کے ہاتھ لگتا تھا مگر ہر شائبۂ التباس کے بغیر اس کی مکمل دریافت نہ ہوتی تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے رہنمائی کی وہ بہترین شکل اختیار فرمائی جسے وحی کہا جاتا ہے جس نے حیاتِ انسانی کے اُن سربستہ رازوں اور مخفی گوشوں سے پردہ اٹھایا جن تک عقل کی رسائی نہ تھی۔ اور جس نے فکر و نظر کی غلطیاں اور حواس کے اوہام یکسر دُور کر دیتے اور حق و صداقت کی صاف اور سیدھی شاہراہ پر کاروانِ انسانیت کو گامزن کر دیا۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ (الحدید: ۲۵)

ایمان بالرسالت کے متضمنات (ا) رسالت پر ایمان لانا درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ اور رحمتِ واسعہ پر ایمان لانا ہے۔ کیونکہ حضرتِ حق کو یہ بات پسند نہ تھی کہ حقِ ابلاغ ادا کیے بغیر انسانوں کا احتساب کیا جائے اور انہیں سزا دے ڈالی جائے۔ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔ (الاسراء: ۱۵)

(ب) ایمان بالرسالت کا ایک اور مفہوم وحدتِ دین کا اقرار ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر دور، ہر علاقے اور ہر قوم میں آنے والے انبیاء کا دین ایک ہی رہا ہے۔ اگرچہ تقاضائے حالات کے مطابق شرائع میں اختلاف ہوتا رہا ہے۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ (البقرہ: ۱۳۶)

(ج) انبیاء و رُسل، انسانیت کے حقیقی اور بلند ترین نمونے ہوتے ہیں۔ وہ مثالی افکار سے عبارت تجریدی ہستیاں نہیں بلکہ مکارمِ اخلاق اور فضائلِ اعمال کی مظہر زندہ شخصیات ہوتی ہیں۔ اُن کا تعلق کسی مافوق الفطرت مخلوق سے نہیں بلکہ گوشت پوست کے انسانوں سے ہوتا ہے۔ قرآن اس خیال کی بڑے زور سے تردید کرتا ہے کہ انسانوں کے لیے رسول کوئی غیر انسان ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس وہ رسالت کا جو مفہوم ہمارے دل و دماغ میں اُتارتا ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء نہ خدا ہوتے ہیں نہ خدائی میں شریک ہستیاں اور نہ خدا کی اولاد ـــــ بلکہ وہ بھی بلحاظِ تخلیق عام انسانوں جیسے انسان ہی ہوتے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ وحی نازل کرتا ہے تاکہ وہ بندوں تک اس کا پیغام پہنچا دیں۔ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔ (ابراہیم: ۱۱)

۳۔ ایمان بالآخرت | کیا داستانِ حیات بس اتنی ہی ہے کہ رحمِ مادر سے اگل دے اور بطنِ گیتی نگل لے۔

اور اس کے بعد کچھ بھی نہ ہو۔ یا جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ "زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے یہیں ہم کو مرنا اور جینا ہے اور موت کے بعد ہم ہرگز اٹھائے جانے والے نہیں" (المومنون: ۳۷) اگر حیاتِ دنیا کی حقیقت یہی ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ ہمارے شعور کی گہرائیوں میں اور ہمارے وجدان میں جو زمانۂ قدیم سے یہ خیال راسخ چلا آرہا ہے کہ غایتِ تخلیق یہی چند سالہ زندگی نہیں بلکہ انسان اس دنیا میں ایک مسافر اور مہمان کی طرح ہے جسے جلد ہی اپنے اصلی گھر لوٹ جانا ہے ——— اس خیال کی بنیاد کیا ہے؟ پوری انسانی تاریخ میں ایک تسلسل کے ساتھ حیات بعد الموت کا تصور ملتا ہے۔ آخر ذہنِ انسان پر اس کا تسلط کیوں؟ قدیم مصری اسی خیال کے زیرِ اثر اپنے مُردوں کی لاشوں کو حنوط کیا کرتے تھے۔ عقیدۂ تناسخ کے پیچھے یہی خیال کارفرما ہے کہ مرنے کے بعد انسان فنا نہیں ہو جاتا بلکہ ایک دوسری زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ اور بعض لوگ رُوح کے جسدِ خاکی سے جُدا ہو جانے کے بعد اسے بحالتِ تجرّد ہی جزا کی لذّت اور سزا کی مُصیبت سے دوچار سمجھتے ہیں۔ اور کچھ دوسرے حضرات کا خیال ہے کہ مرنے کے بعد رُوح، موجودہ اجسام سے بہت لطیف مادّی پیکروں میں جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ اور انسانوں کی ایک بڑی تعداد، وحی کے حوالے سے بعث بعد الموت کا عقیدہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ بہر حال خدا کے پرستار، بتوں کے پُوجنے والے اور فلسفی سبھی اس بات پر متفق ہیں کہ مرنے کے بعد فنا نہیں۔ لہٰذا موت کے بعد زندگی کا یہ شعور جو کم و بیش ہر دل میں پایا جاتا ہے (سوائے ملحدوں اور مادّہ پرستوں کے ایک قلیل گروہ کے) اسے عقل کی گمراہی تو نہیں کہا جا سکتا۔ وہم کی پیداوار بھی نہیں۔ پھر آخر یہ ہے کیا؟ اس کی ایک معقول توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ ایک خالص الہامی تخیّل ہے جو تخلیقِ انسان کے وقت خالق نے اس کی فطرت میں ودیعت کیا۔ اور پھر برابر اس کے لاشعور میں جاگزیں رہا۔ انبیاء نے اس مبہم تخیّل کو عقل و استدلال کی روشنی میں حقیقت کا جامہ پہنایا اور وحی کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے براہِ راست علم پاکر حیات بعد الموت کی تفصیلات بیان فرمائیں۔ الہامی تخیّل کی یہ توجیہ عقل و شعور کو بھی اپیل کرتی ہے اور وجدان بھی گواہی دیتا ہے کہ حقیقت یہی ہے۔ آیئے اس نظریہ کو عقل کی کسوٹی پر پرکھیں۔

دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ چوریاں کرتے ہیں۔ ڈاکے ڈالتے ہیں اور قتل و غارتگری کا بازار گرم کرتے ہیں لیکن قانون کے احتساب سے بالاتر رہتے ہیں، اور بالآخر سینکڑوں اور ہزاروں انسانوں پر ظلم کر کے مر جاتے ہیں۔ اب اگر یہ تمام ظالم اور مظلوم مٹی میں مل کر مٹی ہو جائیں اور کسی

مظلوم کو انصاف اور ظالم کو سزا نہ ملے تو اندھیر گردی کی اس کیفیت پہ عقل سر پیٹ کے رہ جائیگی اور تقاضا کرے گی کہ موت کی سرحد پر ہی ہست و بود کا سارا کھیل ختم نہیں ہو جانا چاہیے بلکہ ایک اور عالم برپا ہونا چاہیے۔

اسی طرح کتنے لوگ ہیں جو نیک کام کرتے ہیں۔ بلند مقاصد کے لیے قربانیاں دیتے ہیں اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے جہاد کرتے ہیں لیکن دنیا جہالت یا حسد کی وجہ سے ان کے فضل و شرف کا اعتراف نہیں کرتی اور اچھے اعمال کا دنیا میں انہیں کوئی صلہ نہیں ملتا۔ ذرا اپنے دل کو ٹٹول کر بتایئے کیا ان نیک افراد کا محروم جزاء رہنا ٹھیک ہے؟ کیا عقل کے پاس اس بے انصافی کا کوئی جواز ہے؟

پھر بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص بہت سے جرائم کا مرتکب ہوتا ہے، اسے دنیا کا قانون بڑی سے بڑی سزا دیتا ہے اور وہ تختہ دار پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ لیکن کیا بے شمار لوگوں کے قاتل، لاتعداد حقداروں کے حقوق کے غاصب اور ان گنت معصوموں پہ مظالم ڈھانے والے مجرم کے لیے یہ سزا اُس کے جرائم کی نسبت سے مکمل سزا ہے۔ ایسے شخص کو دنیا میں انصاف کا تقاضا پورا کرنے والی سزا دی ہی نہیں جا سکتی۔ اس کے لیے تو کوئی دوسرا ہی عالم ہونا چاہیے۔ اسی طرح بعض لوگوں کے اصلاحی کارناموں کے اثرات اتنے ہمہ گیر اور دور رس ہوتے ہیں کہ وہ کروڑوں انسانوں کی زندگیاں سنوار دیتے ہیں۔ اب اگر انسانیت کے ان محسنوں کو اپنے حسنِ عمل کا کوئی بڑے سے بڑا صلہ دنیا میں مل بھی جائے تو کیا وہ مکمل صلہ ہو سکتا ہے؟ یقیناً نہیں۔ لہٰذا ان داعیانِ خیر و صلاح کو مکمل جزا بھی کسی دوسرے ہی عالم میں مل سکتی ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ یہی دوسرا عالم عالمِ آخرت ہے۔ پس ثابت ہوا کہ حیات بعد الموت کا نظریہ ہی عقلاً صحیح نظریہ ہے۔

اس کے بعد بعث بعد الموت کا انکار کیوں؟ کیا مُردوں کو دوبارہ جلا اٹھانا کوئی ناممکن اور محال کام ہے؟ اس سلسلہ میں قرآن دو طرح استدلال کرتا ہے۔ اس کا پہلا استدلال یہ ہے کہ جو ہستی انسان کو عدم سے وجود میں لا سکتی ہے اس کے لیے اسے دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے۔ فَسَيَقُولُونَ مَنْ يُعِيدُنَا ۖ قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ وہ ضرور پوچھیں گے کون ہے جو ہمیں دوبارہ زندہ کرے گا؟ کہو وہی جس نے پہلی بار تمہیں پیدا کیا (الاسراء: ۵۱)۔ قرآن کا دوسرا استدلال یہ ہے کہ "کیا ان لوگوں کو نظر

نہیں آتا کہ جس خدا نے یہ زمین اور آسمان پیدا کیے ہیں اور ان کو بناتے وقت جو نہ تھکا وہ ضرور اس پر قادر ہے کہ مُردوں کو زندہ کرلے۔ کیوں نہیں وہ یقیناً ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے (الاحقاف: ۳۳)۔ ان تصریحات اور واضح حقائق کے بعد بھی آخرت کا انکار کرنے والا کوئی بڑا ہٹ دھرم اور متعصب انسان ہی ہو سکتا ہے۔

دوسری زندگی کا باقاعدہ آغاز مُردوں کے قبروں سے اٹھائے جانے کے ساتھ ہی ہو جائے گا۔ سب سے پہلے ہر انسان کی فردِ عمل پیش ہوگی اور اللہ تعالیٰ نہایت کڑا احتساب کریں گے اور ہر شخص پر اس کی نیکو کارانہ یا مجرمانہ حیثیت ناقابلِ تردید شواہد کی بنیاد پر واضح کر دی جائے گی۔ اس کے بعد سعادت مندوں کا گروہ حیاتِ ابدی سے ہمکنار ہو کر باغِ بہشت میں پہنچ جائے گا جہاں ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے ایسے اسبابِ نعمت مہیا کیے ہوں گے جن سے کوئی آنکھ آشنا نہ ہوگی۔ کسی کان میں اُن کی بھنک تک نہ پڑی ہوگی اور کسی دل میں ان کا خیال بھی نہ گزرا ہوگا۔ دوسری طرف بدنصیبوں کا جمِ غفیر جہنم کے ہولناک شعلوں میں پھینک دیا جائے گا جہاں ہر مجرم اپنی سیہ کاریوں کی پاداش بھگتے گا۔ جہنم کا عذاب مادّی و روحانی دونوں طرح کا ہوگا جس کی سختی کا کوئی اندازہ دنیا میں نہیں لگایا جا سکتا، نہ یہاں کی اذیت و تعذیب سے اسے کوئی نسبت ہی ہو سکتی ہے۔ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا (الفرقان: ۶۵)۔

ایمان کی امتیازی خصوصیات (۱) واضح عقیدہ۔ عقیدۂ اسلام (ایمان) میں جو امتیازی صفات پائی جاتی ہیں وہ کسی دوسرے عقیدہ کو حاصل نہیں۔ یہ ایک واضح عقیدہ ہے۔ اس میں کوئی پیچیدگی اور ابہام نہیں۔ اس کی رُو سے اِس عجیب و غریب اور محکم و متوازن کائنات کا ایک ربّ ہے جس نے اسے پیدا کیا اس کا انتظام فرمایا اور اس میں ہر چیز کو ایک انداز سے وجود بخشا۔ اس کائنات کا رب ہی وہ معبودِ حقیقی ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ کوئی شبیہ و مثیل نہیں۔ اُس کی نہ کوئی بیوی ہے اور نہ اولاد۔ البتہ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ بھی ہے اسی کی مِلک ہے اور ہر چیز اُسی کے تابعِ امر ہے۔ نیز اس کائنات میں موجود تنوع اور کثرت کے پیچھے عقل جس وحدت و ارتباط کی طالب ہے وہ واضح طور پر اِس عقیدہ میں پایا جاتا ہے۔

(ii) فطری عقیدہ۔ یہ عقیدہ فطرتِ انسان سے نہ تو غیر مانوس ہے اور نہ اس کے مخالف ہے بلکہ

اُس کی فطرت میں پوری طرح راسخ ہے۔ قرآن میں اِس بات کو یوں بیان کیا گیا ہے "پس اَے نبی یکسو ہو کر اپنا رُخ اِس دین کی سمت میں جما دو اور قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی سنت بدلی نہیں جا سکتی۔ یہی بالکل راست اور درست دین ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں (الروم: ۳۰)۔ اسی کا مصداق یہ ارشادِ رسول بھی ہے "ہر بچہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے (یعنی اسلام پر) پھر یہ اُس کے والدین ہوتے ہیں جو اسے یہودی بناتے ہیں یا عیسائی یا مجوسی پس معلوم ہوا کہ اسلام ایک فطری عقیدہ ہے جو ہر طرح کے خارجی اثرات سے پاک ہے۔

(iii) ثابت و محکم عقیدہ۔ یہ عقیدہ بجائے خود اتنا مضبوط اور محکم ہے کہ اس میں کسی کمی بیشی کی گنجائش نہیں۔ اور نہ کوئی تحریف اور تبدیلی ہو سکتی ہے کوئی بڑے سے بڑا حاکم، علمی اکادمی یا دینی مشاورت اس امر کی مجاز نہیں کہ عقیدۂ اسلام میں کوئی اضافہ کر سکے۔ یا کسی نئی چیز کو اس کی طرف منسوب کر سکے۔ ایسی ہر کوشش کرنے والے کے منہ پر دے ماری جائے گی "مَنْ احدث فی امرنا هذا ما ليس منه فهو رَدٌّ" (متفق علیہ) قرآن پاک بھی ایسی الحاقی و اضافی کارروائیوں کی صاف صاف تردید کرتا ہے۔ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ (الشوریٰ: ۲۱) "کیا یہ لوگ کچھ ایسے شریک خدا رکھتے ہیں جنہوں نے ان کے لیے دین کی نوعیت رکھنے والا ایک ایسا طریقہ مقرر کر دیا ہے جس کا اللہ نے اذن نہیں دیا۔ اِن تصریحات کے بعد اس امر میں کچھ شبہ نہیں رہتا کہ بدعت یا کوئی اور چیز از قسمِ اساطیر و خرافات عقیدۂ اسلام میں راہ نہیں پا سکتی۔ اور اگر ایسی کوئی چیز اس میں ٹھونسنے کی کوشش کی جائے گی تو وہ مردود ہو گی اور حجت نہ بن سکے گی۔

(iv) مدلل اور مُبرہن عقیدہ۔ عقیدۂ اسلام کوئی ایسا عقیدہ نہیں جو یہ کہے کہ "پہلے مانو پھر جاننے کی کوشش کرو" یا "آنکھیں بند کر کے میرے پیچھے چلے آؤ"۔ اس کے برعکس یہ دلائل و براہین پر مبنی عقیدہ ہے جو دنیا بھر کے لوگوں کو چیلنج کر کے کہتا ہے "هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (البقرہ: ۱۱۱)۔ "اگر سچے ہو تو دلیل لاؤ"۔ اسی طرح یہ عقیدہ صرف قلب و وجدان کو ہی مخاطب نہیں کرتا نہ ان پر اعتقاد کی بنیاد رکھتا ہے۔ بلکہ یہ حجتِ بالغہ، برہانِ قاطع اور تعلیلِ واضح کو رہبر بناتا ہے۔ اور اُن کی وساطت سے دل و دماغ تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ علمائے اسلام کا کہنا ہے کہ منقولات کی اساس معقولات ہیں۔ نیز نقلِ صحیح، کبھی عقلِ صریح کی مخالف نہیں ہوتی۔ چنانچہ جب ہم قرآن و حدیث کا مطالعہ کرتے

ہیں تو ہمیں جابجا وجودِ باری تعالیٰ، اُس کی وحدانیت، احیائے موتیٰ اور دوسری بنیادی تعلیمات انفس و آفاق کے دلائل سے مدلّل ملتی ہیں۔ اور یہ اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ ایمان جس چیز کا نام ہے وہ دلیل و محبّت سے عبارت ہے، اُسے جہالت، تعصّب، ہٹ دھرمی یا اندھی تقلید سے کوئی سروکار نہیں۔

(۷) عقیدۂ وسط و اعتدال۔ یہ عقیدہ خدا کے مُنکرین اور بے شمار خداؤں کے قائلین کے بین بین ایک مسلکِ اعتدال پیش کرتا ہے۔ اور وہ ہے مسلکِ لا الٰہ الا اللہ یعنی ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی طرح صفاتِ باری تعالیٰ کے ضمن میں فلسفۂ یونان کے سلبی تخیّلات اور تشبیہ و تجسیم کے ایجابی نظریات کے مقابلے میں عقیدۂ اسلام ایک طرف لیس کمثلہ شیئ اور ولم یکن لہ کفواً احدٌ کہہ کر مشبّہین کی تردید کرتا ہے تو دوسری طرف فلسفۂ یونان کی تغلیط کرتے ہوئے ذاتِ حق کو حیّ و قیوم، علیم و خبیر، سمیع و بصیر اور فعّالٌ لما یُرید بھی بتاتا ہے اور بے شمار دوسری صفات کا بھی اثبات کرتا ہے۔ ایک بے شعور آدمی جو ہر بات میں آباؤ اجداد کی پیروی کرتا ہے اور کبھی عقل سے کام نہیں لیتا اور ایک عقل پرست جو ہر چیز کی تہ تک پہنچنے کی دھن میں حقیقت و ماہیتِ اُلوہیت کا سُراغ لگانا چاہتا ہے ـــــ دونوں کو یہ عقیدہ راہِ اعتدال پر لاتا ہے۔ پہلے کے لیے اس کی تعلیم ہے کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (ص-۲۹) "یہ ایک بابرکت کتاب ہے جسے (اے محمدؐ) ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں"۔ اور دوسرے کو کہتا ہے: تفکروا فی خلق اللہ ولا تفکروا فی اللہ فتھلکوا (حدیثِ رسولؐ)۔ اللہ کی پیدا کردہ اشیاء میں ضرور غور و فکر کرو لیکن ذاتِ حق کے بارے میں عقل کے گھوڑے نہ دوڑاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہلاک ہو جاؤ"۔ دوسرے عقائد کے مقابلے میں نہ تو یہ کمزوری و بزدلی دکھاتا ہے اور نہ غلبہ و استیلاء کی صورت میں مخالف نظریات کا یکسر قوت خاتمہ چاہتا ہے۔ بلکہ ایک درمیانی راستہ اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے اس کی تعلیم میں کتنا توازن ہے فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ۝ (الروم: ۶۰) "پس اے نبی صبر کرو، بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور تمہیں ہرگز ہلکا نہ پائیں وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے"۔ اور دوسری طرف بڑی فراخدلی سے اعلان کرتا ہے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ اور لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ

دالکفرون :۴ ؎ "دین میں کوئی زبردستی نہیں" -نیز "تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین"۔
انبیاء و رُسل کے بارے میں دنیا افراط و تفریط کا شکار ہو جاتی ہے۔ بعض غالی معتقد انہیں درجہ الُوہیت پر فائز کر دیتے ہیں جبکہ بعض دوسرے بد باطن اور خبیث فطرت لوگ انہیں اتباعِ شہوات اور ارتکابِ منکرات کی پستیوں میں دھکیل دیتے ہیں لیکن عقیدۂ اسلام ان کو نہایت پاکباز، عفت و عصمت کے پیکر، تمام انسانوں سے افضل اور خدا کے محبوب بندوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے وحی و رسالت کے لیے انسانوں ہی کے اندر سے منتخب کر لیا ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ عقیدہ ایک عقیدۂ وسط ہے ـــــ جبر و اختیار کے دو انتہائی نظریات میں بھی یہ ایک بیچ کی راہ دکھاتا ہے۔ اس کی نظر میں انسان نہ تو مجبورِ محض ہے نہ مختارِ مطلق۔ اِس کی رُو سے کائنات میں ایک با اختیار ہستی تو وہ ہے جو تمام اختیارات کا سرچشمہ ہے اور جس کے اختیارات لامحدود ہیں اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ اور دوسری با اختیار ہستی خود انسان ہے جس کا اختیار محدُود ہے اور جو سراسر اللہ تعالیٰ کے اذن و مشیّت کے تابع ہے پس انسان اختیار سے بہرہ ور تو ہے لیکن یہ اختیار خدا کا عطا کردہ ہے لہٰذا لامحدود نہیں اور اس کی بالکل نفی بھی غلط ہے۔ "وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ"۔

عقیدۂ اسلام کا جتنا گہرا مطالعہ کرتے چلے جائیے اس کا افراط و تفریط سے پاک کردار سامنے آتا جائے گا۔ اس کی کسی تعلیم کو اٹھا کر دیکھ لو، انسانیت کو انتہا پسندی سے بچا کر حقیقت پسندی کی راہِ اعتدال کا شعور بخشتی نظر آئے گی۔ اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔